شاہ محمد جعفر پھلواروی

روحِ اجتماع اور جذبۂ تعاون

بچوں کی کتاب میں یہ حکایت آپ نے پڑھی ہوگی کہ: کسی گاؤں میں آگ لگ گئی۔ لوگوں نے اسے بجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن آگ بڑھتی ہی گئی۔ آخر سب کو اسی میں خیر نظر آئی کہ بستی چھوڑ کر جلد سے جلد بھاگ جائیں۔ پہلے عورتوں بچوں کو روانہ کیا پھر جو ضروری اثاثہ اس عجلت میں لے جا سکتے تھے لے گئے۔ اس افراتفری میں دو شخص رہ گئے۔ ایک نابینا تھا اور دوسرا لنجا۔ نابینا راستہ دیکھ نہیں سکتا تھا اور لنجا چل نہیں سکتا تھا۔ ایک آنکھوں سے معذور تھا اور دوسرا پیروں سے۔ ساری بستی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ گئی لیکن یہ دونوں مجبور و معذور فریاد کرتے رہ گئے۔ جب اپنی جان خطرے میں ہو تو دوسروں کی جان بچانے کی فکر کون کرتا ہے؟ آگ برابر بڑھتی جا رہی تھی اور قریب تھا کہ یہ دونوں معذور بھی اس کی لپیٹ میں آجائیں۔ یکایک نابینا کو ایک تدبیر سوجھی۔ وہ ٹٹولتا ہوا لنجے کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ تم میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ۔ نابینا بیٹھ گیا اور لنجے کو سہارا دے کر اپنے کاندھے پر سوار کر لیا اور لٹھیا کے سہارے کھڑا ہو گیا اور لنجے سے کہا کہ اب تم راستہ بتاتے جاؤ۔ اس طرح دونوں صحیح سلامت بستی سے باہر آگئے اور آگ کی لپیٹ سے محفوظ ہو گئے:

اے برادر قصہ چوں پیمانہ ایست معنی اندر وے مثال دانہ ایست (رومیؒ)

روحِ اجتماع کی اس سے بہتر مثال شاید ہی کوئی اور مل سکے۔ اس چھوٹے سے قصے میں اجتماعیت کے بے شمار پہلو سمٹ کر آگئے ہیں۔ نابینا اور لنجا الگ الگ شخصیت ہونے کی صورت میں جان کے خطرے سے دوچار تھے لیکن جب لنجا نابینا کے کاندھوں پر سوار ہو گیا اور دونوں ایک شخصیت بن گئے تو دونوں کی جداگانہ صلاحیتیں ایک دوسرے کے کام آگئیں۔ لنجا چل نہیں سکتا تھا مگر دیکھ سکتا تھا۔ نابینا دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن چل سکتا تھا۔ جب لنجا نابینا کے کاندھوں پر سوار ہو گیا اور دونوں ایک وحدت میں تبدیل ہو گئے تو لنجا نابینا کی آنکھیں بن کر راستہ دیکھنے لگا اور نابینا لنجے کے پاؤں بن کر محفوظ راستے پر چلنے لگا۔ نابینا کی چلنے کی صلاحیت لنجے کی آنکھوں کے بغیر بے کار تھی اور لنجے کی بینائی نابینا کے پیروں کے بغیر بے مصرف۔ علاحدہ علاحدہ دونوں صلاحیتیں بے نتیجہ تھیں لیکن جب دونوں متحد ہو گئے تو قدرتی طور پر دونوں کی جداگانہ صلاحیتیں ایک دوسرے کے کام آگئیں۔ الگ الگ رہنے کی صورت میں کسی کی جان نہ بچ سکتی تھی۔ لیکن باہم مل کر دونوں نے اپنی جانیں بچالیں۔

یہ ہے اجتماعیت کی ایک عمدہ تمثیل۔

اگر ہم اپنی پوری قوم کو اسی عینک سے دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ اس کی بقا اجتماعی روح کو اپنانے میں اور بربادی انفرادیت و انقطاعیت میں ہے۔ وہ کونسی بڑی سے بڑی صلاحیت ہے جو ہماری قوم کے افراد میں موجود نہیں؟ لیکن جو کچھ ہوتا رہا وہ ہم گیارہ سال تک دیکھتے رہے ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ رکھنے والے لیڈروں کی ساری توانائیاں تعمیر کی بجائے تخریب میں صرف ہوتی رہیں۔ ہر اہل فکر نے اپنی قوتیں صرف اپنے آپ کو بنانے اور دوسروں کو بگاڑنے میں صرف کیں۔ اگر ان کے دماغ اور ان کی توانائیاں اجتماعیت کی روح سے کچھ بھی آشنا ہوتیں اور متحد ہو کر کام کرتیں، تو ہمارے قومی و ملکی مسائل کب کے حل ہو چکے ہوتے لیکن فرقی تعصبات اور جماعتی اختلافات تمام انفرادی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضائع کرتے رہے۔ ہر ایک کے پیش نظر قومی خدمت صرف اپنی خدمت تھی۔ فراخ دلی کی جگہ تنگ نظری کام کر رہی تھی۔ رواداری کی بجائے تعصب کارفرما تھا۔ نہ اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو نفع پہنچایا نہ دوسروں کی توانائیوں سے خود فائدہ اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سبھی کو ایک آگ کی لپیٹ میں آکر بھسم ہونا پڑا۔

قرآن پاک نے اجتماعی وابستگی پہ بارہا زور دیا ہے اور تفریق اجتماع سے بار بار روکا ہے۔ ایک جگہ تو بہت واضح لفظوں میں ایجابی و سلبی دونوں پہلوؤں کو یوں بیان فرمایا کہ:

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا — اللہ کی رسی کو اجتماعی روح کے ساتھ مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ نہ پیدا کرو۔

یہاں جمیعاً کے معنی "تم سب کے سب" نہیں۔ اس کے لیے عربی میں عموماً اجمعین کا لفظ آتا ہے یہاں جمیعاً سے مقصد اجتماعی اسپرٹ کے ساتھ اللہ کی رسی سے چمٹ جانا۔ اجتماعی اسپرٹ کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر ایک گھڑی کے تمام پرزوں کو اکٹھا کر کے ایک رومال میں باندھ لیجیے اور کلاک میں رکھ دیجیے تو گھڑی نہیں چلے گی۔ گھڑی اسی وقت چلے گی جب اس کے تمام پرزے ایک مربوط اور منظم شکل میں باہم پیوستہ ہوں اور ان کے اندر اس نظم و ضبط کے ساتھ ایسی ہم آہنگی ہو کہ ہر پرزہ ایک ہی مقصد کے لیے حرکت کر رہا ہو۔ بظاہر کوئی پرزہ جانب راست سے جانب چپ میں گردش کر رہا ہوگا اور کوئی بائیں سے دائیں گھوم رہا ہوگا اور دونوں سمتوں میں حرکت کر رہا ہوگا۔ اور کوئی بالکل ساکن بھی ہوگا لیکن سب کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے صحیح رفتار اور ٹھیک وقت بتانا۔ نظم و ضبط اور ہم آہنگی کی یہی روح ہے جسے لفظ جمیعاً سے تعبیر کیا گیا ہے۔ محض بھیڑ کو یکجا کرنا مقصود نہیں کیونکہ پرزوں کی بے ربط یکجائی سے گھڑی نہیں چلتی۔

اس وقت ہمارے اندر اگرچہ ایسے افراد نہیں جو تمام صلاحیتوں کے تنہا مالک ہوں لیکن جداگانہ طور پر اعلیٰ سے

اعلیٰ صلاحیت کے مالک موجود ہیں۔ علوم، فنون، افکار، تنظیم، امامت (لیڈرشپ)، دیانت، امانت، اخلاق، تقویٰ، سیاست وغیرہ کی وہ کون سی صلاحیت ہے جو آج ہمارے مختلف افراد میں موجود نہیں؟ لیکن ہوتا یہ رہا کہ جس کے پاس جو صلاحیت ہوئی وہ اسی کو "کل" سمجھ کر بیٹھ گیا اور اس بنا پر اپنی ایک جداگانہ پارٹی بنا کر دوسری صلاحیتیں رکھنے والوں سے بے نیاز ہو گیا۔ نہ فقط بے نیاز ہو گیا بلکہ ان صلاحیتوں کو اپنی پارٹی میں کوئی مقام ہی نہ حاصل کرنے دیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے ان صلاحیتوں کی ضرورت و اہمیت سے بھی منکر ہو گیا۔ اگر کسی میں بڑی اچھی تنظیمی صلاحیت ہوئی تو اس نے اسی صلاحیت کی اساس پر ایک فرقہ بنا لیا اور سمجھ بیٹھا کہ اگر عسکری تنظیم حاصل ہو گئی تو سب کچھ حاصل ہو گیا۔ اب نہ علوم و فنون کی ضرورت ہے نہ سیاست میں کسی کی امامت تسلیم کرنے کی حاجت۔ یہی حال اہل علم کا ہوا۔ انہوں نے فقہی مسائل کا کچھ مطالعہ کر لیا تو اس ایک ہلدی کی گانٹھ کو لے کر روایتی چھُپیا کی طرح عطاری کی دوکان کھول لی اور ہر فن میں اپنی بے شرکت غیرے امامت و امارت کا سکہ بٹھانا شروع کر دیا۔ اگر کوئی سیاست کے میدان میں حسن اتفاق سے کامیاب ہو گیا تو پارٹی لیڈرشپ کی الگ دنیا بسالی اور یہ سمجھ بیٹھا کہ اسی کامیابی میں دنیا و آخرت کی ساری نعمتیں سمٹ کر آ گئیں اور اس سے آگے کوئی چیز نہیں۔ یہی حال "اہل روحانیت" کا بھی ہوا کہ انہوں نے بعض اقدار کی محافظت کے نام سے ایک الگ خانقاہ کھول لی اور اپنے تئیں "دنیا داری" کے کاموں سے انقطاع کر لیا اور یہ سمجھ لیا کہ ترک دنیا کر کے آخرت حاصل کر لی جائے گی۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ:

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سجود — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
زباں نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں (اقبالؒ)

ہم یہ نہیں کہتے کہ ان حلقوں کے سربراہوں کے اندر مخصوص صلاحیتیں نہیں۔ وہ بڑی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہیں لیکن وہ بہر حال جزئی ہیں ایسی کُلی نہیں جو دوسری صلاحیتوں سے بے نیاز کر دیں۔ معاشرے کی تعمیر کے لیے صرف ایک یا چند ہی صلاحیتیں درکار نہیں۔ بہت سی صلاحیتیں مطلوب ہیں۔ وہ سب ایک وحدت کی شکل میں بروئے کار آئیں تو ایک اور ایک مل کر یقیناً گیارہ ہو جائیں گے۔

انقطاعی یا انفرادی طرز زندگی کے جو اسباب ہوتے ہیں وہ عموماً یہ ہیں:

(۱) احساس شکست خوردگی ـــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اپنے اندر انسان قوتِ مقابلہ نہیں پاتا ـــ خواہ مادی طاقت سے ہو یا علمی قوت سے ـــ تو اپنی ٹولی الگ بنالیتا ہے۔ اس میں فراریت ہوتی ہے۔ اور اسی فرار میں اسے اپنی محافظت و بقا نظر آتی ہے

(۲) مایوسی ــــ یعنی انسان جس تصور کا قیام چاہتا ہے اس کے متعلق وہ متعلقہ افراد سے مایوس ہو جاتا ہے اور اپنی جماعت الگ بنا لیتا ہے۔ اس میں بھی سعی پیہم سے گریز کا جذبہ ہوتا ہے۔

(۳) غرور یعنی اپنے متعلق مغالطۂ نفس۔ گویا وہ سمجھتا ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ ایسا جامع ہے کہ اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اسی اساس پر وہ الگ گروہ بندی کر لیتا ہے۔

(۴) ہوس اقتدار ــــ اس سے یہ مراد ہے کہ ایک انسان یہ محسوس کرتا ہے فلاں تنظیم میں شامل رہنے سے میری ہستی نمایاں نہیں رہتی یا لیڈرشپ دوسروں کے حصے میں آجاتی ہے۔ اس جذبے سے وہ کوئی نہ کوئی نکتہ نکال کر ایک علاحدہ گروہ قائم کر لیتا ہے۔

(۵) محض فتنہ پسندی یا بیوقوفی ــــ اس میں دراصل کوئی معقولیت نہیں ہوتی لیکن اپنے طرزِ عمل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے کئی نکات پیدا کر لیے جاتے ہیں۔ یہ عموماً کسی کی انگیخت پر ہوتا ہے جس سے آگے چل کر کوئی صلہ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔

غرض اسی قسم کے اسباب ہوتے ہیں جن سے گروہ اور پھر گروہ در گروہ بنتے ہیں۔ اور غالباً تمام قوموں سے زیادہ اہل اسلام اس کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ تفریق کبھی سیاست کی وجہ سے ہوئی اور کبھی مذہب کے نام پر۔ اختلافات اصولی بہت ہی کم نظر آئیں گے۔ زیادہ تر یہ تفریقات فروع سے شروع ہوئے اور فروع نے فروغ پا کر اصول کی جگہ حاصل کر لی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جب فروع پر زیادہ زور دیا جائے تو اصول گم ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں پھر وہی فروع اصول بن جاتے ہیں۔ اتحادِ عمل اصول پر بہر حال قائم رہنا چاہیئے لیکن یہ فروعی اختلافات کے ہنگاموں میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ اتحاد اگر محال نہیں تو دشوار تر ضرور ہو جاتا ہے۔

ایک بڑی مصیبت یہ ہوئی ہمارے معاشرے میں اتحادِ عمل کو پارہ پارہ کرنے والے اختلافات کوئی اہم مسائل نہ تھے۔ بعض بالکل بے ضرورت اور بعض قطعاً فرعی و جزئی۔ "مسائل" دراصل وہ ہیں جن کو ہم مسائل زندگی کہتے ہیں نہ کہ وہ جن کا تعلق نہ عملی زندگی سے ہے اور نہ آخرت میں اس کے متعلق کوئی باز پرس ہوگی۔ مثلاً معاشرے میں کبھی ایک علمی مسئلہ خواہ مخواہ چھڑ گیا کہ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں تو اوّلاً تو اس لایعنی مسئلے کی قوم کو دنیا یا آخرت میں کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اس لیے اس پر کسی قسم کی گفتگو ہی بے ضرورت تھی۔ لیکن اس پر مکالمے اور مناظرے شروع ہو گئے اور دو مکاتب فکر سامنے آکر قوم دو گروہوں میں منقسم ہو گئی۔ اس کا آسان حل یہ تھا کہ بھئی مسئلے کی نوعیت کچھ بھی ہو آؤ ہم تم سچ ہی بولا کریں اور سچائی کا ساتھ دیں۔ اور اس باب میں باہمی تعاون سے کام لیں اور دروغ کا فروغ نہ ہونے دیں۔ اسی طرح اس بحث کو ترک کر

دیں کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ آؤ ہم سب مل کر قرآن کو اپنی عملی زندگی میں سمو لیں۔ یوں ہی اس مسئلے پر کوئی گفتگو نہ کریں کہ حضورؐ کو خدا نے عالم الغیب بنایا تھا یا نہیں۔ بس آؤ ہم اپنے علم و فن میں بیش از بیش اضافہ کرتے جائیں۔ سیدنا مسیح زندہ ہیں یا نہیں؟ اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ ہمارا فائدہ اس میں ہے کہ ہماری قوم خود زندہ ہو۔ امام مہدی ابھی تک غار سامرہ میں چھپے بیٹھے ہیں یا نہیں؟ اس سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں۔ قومی مفاد اس میں ہے کہ ہر فرد قوم اپنے طرز عمل سے بنگاہِ خداوندی میں ہادی و مہدی قرار پائے۔ خلافت رسولؐ کے اصلی مستحق حضرت ابوبکرؓ تھے یا حضرت علیؓ؟ اب اس بحث میں کوئی فائدہ بجز تفریق کے حاصل نہیں۔ اس وقت ہمارا کام یہ ہونا چاہیئے کہ دنیا میں نظامِ خلافت قائم ہو۔ ان ذہنی عیاشیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کے پیچھے نماز نہیں ادا کر سکتا اور مساجد اللہ میں بھی تفریق ہو گئی ہے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کی نماز جنازہ نہیں پڑھتا بلکہ ایک "پارٹی" دوسری "پارٹی" کو خارج از اسلام تصور کرتی ہے۔ ہماری تاریخ ایسے قتال و جدال کی داستانوں سے رنگین ہے جن کی بنیاد اسی قسم کے غیر ضروری اور اختلافی مسائل پر رکھی گئی تھی۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ مسائل کی غیر ضروری موشگافیوں کی عادت پڑ گئی۔ پاکستان کے ایک مشہور شہر میں کچھ عرصہ قبل یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ اصحابِ کہف کے کتے کا رنگ سفید تھا یا سیاہ۔ ہندوستان کے ایک شہر میں اہل علم کے درمیان اس مسئلے پر مناظرہ ہوا کہ براق کا گوشت حلال ہے یا حرام! سبحان اللہ وبحمدہ۔

جب اس قسم کے لایعنی مسائل چھڑ کر فرقے بندیاں پیدا ہو جائیں تو روح تعاون بالکل ختم ہو جاتی ہے اور اجتماعیت کی اسپرٹ گیس بن کر اڑ جاتی ہے اور یہ تقریباً محال ہو جاتا ہے کہ ایک فرد دوسرے فرد کی یا ایک فرقہ دوسرے فرقے کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے یا اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے پھر وہ گویا ایسے نابینا اور ایسے لنجے بن جاتے ہیں جو آگ لگنے پر بھی افادہ و استفادہ کے فلسفے پر عمل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ اور جل مرنا انہیں زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

قرآن نے اسی کافرانہ و مشرکانہ اندازِ زیست سے یوں روکا ہے کہ:

ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیء

جو لوگ دینی فرقے اختیار کر کے گروہ گروہ ہو جاتے ہیں اے رسول! تمہارا ان سے کچھ واسطہ نہیں۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ:

ولا تکونوا من المشرکین ہ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا

دیکھو مسلمانو! تم ان مشرکوں کی طرح نہ ہو جانا جو دینی فرقے بندیاں پیدا کر کے گروہوں میں منقسم ہو گئے۔

ان دونوں تہدید آمیز آیتوں پر غور کیجئے۔ ان میں دینی فرقہ بندی کو کفر اور شرک، دونوں ہی قرار دیا گیا ہے۔ دینی فرقہ بندی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک فرقے کی ہر بات کی حمایت اور دوسرے کی ہر چیز کی مخالفت ضروری سمجھ لی جائے۔ اس طرح کی حمایت و مخالفت کسی دلیل یا معقولیت کی بنا پر نہیں ہوا کرتی بلکہ اس میں صرف عصبیت کارفرما ہوتی ہے اور اسی کا نام قرآنی اصطلاح میں حمیتہ الجاھلیہ ہے۔

اجتماعیت اور تفریق دو متضاد جذبے ہیں جو ایک جگہ کبھی جمع نہیں ہو سکتے اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ قرآن دونوں کی تائید کرے۔ وہ ایک ہی چیز کی تائید و تاکید کرتا ہے واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً۔ اور دوسری سے پورے زور کے ساتھ روکتا ہے ولا تفرقوا۔

جن غیر ضروری مسائل پر امت میں جدال و قتال ہوتا رہا ہے ان کی کوئی اہمیت زندگی میں نہ تھی اور نہ آج ہے۔ اس وقت تو ہمارے مسائل اور ہی ہیں۔ ہمارے مسائل یہ ہیں کہ دینی شعور کس طرح پیدا کیا جائے؟ بے روزگاری کیسے دور ہو؟ آبادکاری کیوں کر ہو؟ اخلاقی تربیت کی کیا سبیل ہو؟ تعلیم کا کیا نظام ہو؟ ہمارے ملک کی بین الاقوامی ساکھ کس طرح بلند ہو؟ دوسرے ممالک سے ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہوں؟ پانی اور کشمیر کے مسئلے کا کیا حل ہو؟ صحت عامہ کس طرح بحال کی جائے؟ صنعت و حرفت میں کیونکر ترقی کی جائے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہیں آج کے مسائل جو صرف فلسفیانہ اور مناظرانہ موشگافیاں نہیں چاہتے عملی حرکت چاہتے ہیں۔ یہ ذہنی عیاشیاں نہیں بلکہ قوم و ملک کی بقا و ارتقا کا دار و مدار انہی مسائل پر ہے۔ اس میں ہمارا صرف زبانی اتحاد مطلوب نہیں بلکہ جو شغف ہمیں غیر ضروری مسائل سے رہا کیا ہے اس سے کہیں زیادہ بے چینی ان مسائل کو حل کرنے میں درکار ہے۔ اتنی زیادہ بے چینی اور شغف مطلوب ہے کہ غیر ضروری تفریق اُمت پیدا کرنے والے مسائل ان میں دب کر ختم ہو جائیں۔

علمی مسائل پر گفتگو کوئی بری چیز نہیں بلکہ بعض مرحلوں پر ضروری ہوتی ہے۔ ہر ہر چیز پر اتفاق رائے ہونا بھی ضروری نہیں۔ اس لیے ایسی علمی گفتگو سے ـ بشرطیکہ اس سے امت میں دینی تفریق نہ پیدا ہو ـــ بہت سے پہلو سامنے آجانے کی وجہ سے دماغ و ذہن میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور جمود ٹوٹتا ہے۔ اس لیے ہم اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اصل مسائل زندگی سے ہماری دلچسپیاں کم نہ ہوں اور باہمی اختلاف رائے سے تفریق امت نہ ہو بلکہ ایک دوسرے سے استفادہ مقصود ہو۔ ہر ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے فائدہ حاصل کرے اور اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو نفع پہنچائے یہی وہ روح اجتماع اور جذبۂ تعاون ہے جو قوم کے افراد کو ایک وحدت بنا دیتا ہے اور تمام مختلف صلاحیتیں اور توانائیاں سمٹ کر ایک مرکز پر آجاتی ہیں اور اس ارتکاز میں ایسی بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کمی صلاحیتوں یا توانائیوں کی نہیں جو کچھ کمی ہے وہ روح اجتماع اور جذبۂ تعاون کی ہے اور ضرورت اسی خامی کو دور کرنے کی ہے:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں